اشفاق احمد کی اردو شاعری

ڈاکٹر شازیہ صدف

اسسٹنٹ پروفیسر اردو

اسلام آباد ماڈل کالج برائے خواتین، G10-2، اسلام آباد

ASHFAQ AHMAD AS AN URDU POET
AN INTRODUCTORY STUDY

Shazia Sadaf, PhD

Assisstan Professor of Urdu

Islamabad Model College (W), G10-2 Islamabad

Abstract

Ashfaq Ahmad is considered as an outstanding Urdu dramatist and prose writer of 20th century but poetic aspect of his literary life is least known. He has written some poems and ghazals which are not published. In ghazals he had used classical similes, metaphors and illustrations. He followed classical tradition in ghazals. In the poems, there is a variety of topics like indifference of society, rights of women, famine in Bengal etc. Although his poetry is not considered on a par with his prose yet the element of creativity is easily traced in it.

Keywords:

اردو، نثر، غزل، تلمیحات، مثنوی، قحطِ بنگال، استفساریہ، اشفاق احمد

دنیاے ادب میں اشفاق احمد کا نام ایک روشن ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی تخلیقی شخصیت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی ادب کے مختلف شعبوں میں ظہور کرتی ہے اور وہ نثر کے حوالے سے بیسویں صدی کی ایک قد آور شخصیت قرار پاتے ہیں لیکن قارئین و ناظرین اُن کی شخصیت کے اس پوشیدہ رخ سے آگاہ نہیں ہیں کہ انھوں نے پنجابی کی طرح اردو زبان میں شاعری کو بھی وسیلہ اظہار بنایا ہے اور کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔راقمہ کو اُن کا غیر مطبوعہ اردو کلام اُن کی ایک ذاتی ڈائری سے دستیاب ہوا ہے(۱) ذیل میں اُن کے اس غیر مطبوعہ اردو کلام کا تعارف اور جائزہ نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

غزلیں

اشفاق احمد کے غیر مطبوعہ دستیاب اردو کلام میں گیارہ(۱۱) غزلیں شامل ہیں جن میں اشعار کی کل تعداد تہتر (۷۳) ہے۔دو ایک جگہ نامکمل اور ادھورے مصرعے/شعر بھی موجود ہیں۔بعض مصرعوں میں تصحیح و ترمیم بھی کی گئی ہے۔ان غزلوں میں انھوں نے اپنے تخلص کے طور پر ''اشفاق'' اور ''شفو''(عُرف) دونوں نام استعمال کیے ہیں:

اشفاقؔ اس جہاں سے گزر جایئے گا اب　　کیا سوچتے ہیں آپ کھڑے رہگزار میں
اشفاقؔ سر پہ بار جو ہستی کا آ پڑا　　اس بوجھ کو اگر نہ اُٹھائیں تو کیا کریں
باجی کو کوئی خلدِ بریں میں یہ خبر دے　　اب دنیا میں شفوؔ بھی ہے مہماں کوئی دن اور

اشفاق احمد کی غزل موضوع و اسلوب دونوں سطحوں پر روایت پرستی کی مظہر ہے۔ان غزلوں کا بنیادی موضوع ''عشق'' ہے:

عشق کا مذہب نرالا ہے انوکھی اس کی خُو　　با برہمن رام رام اور با مسلماں اللہ ہو

عشق کے حوالے سے مختلف کیفیات اور احساسات کو سپردِ قلم کیا گیا ہے۔مثلاً:

خود تو ڈوبا تھا ہمیں بھی ساتھ لے ڈوبے گا اب　　دِل کسی کی یاد میں گم ہم کو دل کی جستجو

کلاسیکی غزل کی پیروی کرتے ہوئے حسنِ محبوب کے مرقعے بھی پیش کیے گئے ہیں:

بام پر دیکھ کر ماہ(۲) اُن کو ہویدا نہ ہوا　　مہر نکلا مگر انگشت بدنداں نکلا

نہیں اٹھتا جو خنجر (۳) نہ سہی مژگاں تو اُٹھ جائیں ذرا بسمل کو دیکھو رمیاں کیوں چھوڑے جاتے ہو
رہینِ ماہتاب (۴) ذرا چھپ کے چلو، چھپ کے چلو لگ نہ جائے کہیں تاروں کی نظر آج کی رات

ان غزلوں میں روایتی عاشق ومحبوب کی جھلک ملتی ہے:

اب اُن کو یاد آتے ہیں اپنے جفا و جور جب خاک بھی رہی نہ ہمارے مزار میں
ترے رونے کا اُس دِل پر بھلا کیا اثر (۵) ہونا ہے وہ آہیں اور ہوتی ہیں وہ نالے اور ہوتے ہیں

''موت'' اور ''بے ثباتی دنیا'' کا موضوع بھی اشفاق احمد کی توجہ کا مرکز بنتا ہے:

یہ محفلیں یہ زندہ دِلی اور یہ صحبتیں قائم رہیں گی ہم ہی نہ ہوں گے بہار میں
اس ماہ رہائی کی مجھے بھی تو ہے امید یہ دہر ہے میرے لیے زنداں کوئی دن اور
اربابِ مسرّت یہ گزر جائیگی مدت شاداں کوئی دن اور کہ گریاں کوئی دن اور
جب ہم نہ رہے کس پہ ستم گاری یہ ہوگی لے خوب ستا گردشِ دوراں کوئی دن اور

اشفاق احمد کی غزلوں کا اسلوب بھی کلاسیکی رنگِ غزل میں ڈوبا ہوا ہے۔ان میں قفس، بسمل، ساقی، شباب، شمع، پروانہ، قطرہ اور طوفان جیسے روایتی علائم ورموز استعمال کیے گئے ہیں۔مثلاً:

یوں پتنگا لپکتا (۶) تو ہے زبانِ شمع پر کیا خبر اس کو یہ سب کچھ اجل (۷) کا ہے تار و پو
نگاہِ سرمہ سا جن کو جلا لے اور ہوتے ہیں وہ بسمل جن کو خود قاتل سنبھالے اور ہوتے ہیں

انھوں نے حسن محبوب کے بیان کے لیے جن تشبیہات سے کام لیا ہے۔وہ بھی روایت کے ساتھ نباہ کا پتا دیتی ہیں۔مثلاً:

مجھے بھی ذرا چشمِ میگوں سے دیکھو مرا ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
اجازت ہے میں آپ کے ہونٹ چھولوں؟ کہ بجلی چرانے کو جی چاہتا ہے

کہیں کہیں تلمیحات کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔

جان دے کر تری محفل کے سزا وار ہوئے جسم جانا تھا جسے مصر کا زنداں نکلا
جلوہ فرما ہے کوئی برقِ نظر آج کی رات غیرتِ طور ہے اشفاق کا گھر آج کی رات

اُن کی بعض غزلوں میں مطلع موجود نہیں ہے اور بعض غزلوں میں مطلع ثانی کی مثالیں بھی مل

جاتی ہیں۔اُن کی بیشتر غزلوں کی زمینیں اردو کے معروف شعرا سے مُستعار لی گئی ہیں۔مثال ملاحظہ کیجیے:

صاحبِ کرم(۸) کو بھی رحم کے قابل پایا　　جس سے شکوہ کیا تقدیر کا نالاں نکلا
(اشفاقؔ)

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سرو ساماں نکلا　　قیس،تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
(غالبؔ)

ہم بھی کیوں کھول نہ لیں توبہ کا در آج کی رات　　آؤ جی بھر کے جئیں جانِ جگر آج کی رات
(اشفاق)

عشق مہمان ہوا حسن کے گھر آج کی رات　　جذبۂ دل ہے بآغوشِ اثر آج کی رات
(ظفر علی خان)

بعض غزلوں میں زمین یکساں نہیں ہے،صرف بحر اور ردیف یکساں ہے، قافیے کا فرق ہے۔

مثالیں دیکھیے:

غم خانۂ ہستی میں ہوں مہماں کوئی دن اور　　کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور
(اشفاقؔ)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
(غالبؔ)

تصور کی دنیا میں اِک بار آؤ　　کہ پھر دھوکا کھانے جی چاہتا ہے
(اشفاقؔ)

مدینے کو جائیں یہ جی چاہتا ہے　　مقدر بنائیں یہ جی چاہتا ہے
(بہزادؔ لکھنوی)

اپنے لیے تو گوشۂ فردوس چن لیا　　تن(۹) تنہا مجھ کو چھوڑ دیا خارزار میں
(اشفاقؔ)

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں　　کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
(بہادر شاہ ظفرؔ)

یہ غزلیات ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اشفاق احمد نے کلاسیکی غزل کو شعرا کا مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ ان شعرا سے ذہنی طور پر متاثر بھی تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ غزلیں اردو شاعری میں اشفاق احمد کے مقام کو متعین نہیں کرتیں بل کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو کے ایک بڑے نثر نگار کی روایتی سی شاعری کے زمرے میں آتی ہیں۔

نظمیں

اشفاق احمد کے غیر مطبوعہ دستیاب کلام میں سترہ (۱۷) نظمیں، سات (۷) قطعات، ایک (۱) مثنوی اور ایک (۱) فارسی قطعہ شامل ہے۔ اُن کی بیشتر نظموں کے ساتھ تاریخیں درج کی گئی ہیں۔ ان تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشفاق احمد نے ابتدا میں نثر اور شاعری دونوں ذرائعِ اظہار کی جانب توجہ دی تھی لیکن بعد ازاں وہ نثر ہی کو لے کر چلے اور شاعری کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے فن کار کے رجحانات اور صلاحیتوں کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ اسی لیے شعر گوئی کے شغف سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے نثر کے میدان میں اشہبِ قلم دوڑانے لگے۔ اُن کی غیر مطبوعہ نظموں کے عنوانات اور درج شدہ تواریخ کی فہرست درج ذیل ہے۔

- رخِ کس نے یوں پھیرا ہے — ۱۲۔فروری ۱۹۴۵ء
- جب اور اب — ۱۹۔فروری ۱۹۴۵ء
- ہر گل پہ نثار — ۲۷۔فروری ۱۹۴۵ء
- مروت — ۱۵۔مارچ ۱۹۴۵ء
- منجمد بوسہ — ۲۰۔جون ۱۹۴۵ء
- رومانوں کا بچپن — تاریخ درج نہیں
- پومپیائی — ۲۴۔جون ۱۹۴۵ء
- بلاعنوان — ۱۰۔جون ۱۹۴۵ء
- برساتیات (قطعات) — یکم جولائی ۱۹۴۵ء
- لاشعور — ۱۲۔جولائی ۱۹۴۵ء

- کرائے کی سائیکل	۲۴۔جولائی ۱۹۴۵ء
- ایٹم بم	۲۴۔جولائی ۱۹۴۵ء
- اب کی دیوالی	۱۴۔اکتوبر ۱۹۴۵ء
- پیروانِ ہلاکو کی لاشیں	۳۰۔اکتوبر ۱۹۴۵ء
- جمود	تاریخ درج نہیں
- ایک سہرا	۲۰۔نومبر ۱۹۴۵ء
- کوی	۱۲۔جنوری ۱۹۴۶ء
- اودرکوٹ	۲۷۔فروری ۱۹۴۶ء
- دہریہ	۱۰۔جون ۱۹۴۷ء
- اتحاد کے جھنڈے (مثنوی)	تاریخ درج نہیں

ان نظموں میں پابند نظم اور آزاد نظم، دونوں قسم کی ہیئتیں اختیار کی گئی ہیں البتہ پابند نظموں کے اکثر مصرعے وزن سے تہی محسوس ہوتے ہیں۔غزلوں کی طرح نظموں کے بھی بعض مصرعے ادھورے ہیں۔ان میں سے بیشتر نظمیں بچپن کی یادوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل ہیں اور شاعر کے ہلکے پھلکے رومانوی تجربوں کو بیان کرتی ہیں۔مثلاً اُن کی مثنوی کا آغاز ملاحظہ کیجیے:

ہیں اکثر مجھے یاد بچپن کی باتیں — لڑائی کے دن دھینگا مشتی کی راتیں
کرشنا سے رہتی تھی ہر دم لڑائی — کہ مقصود تھی ہم کو ہر دم لڑائی
اگرچہ وہ منی تھی اور میں تھا بچہ — وہ ہندو تھی پگی تو مُسلم میں پکا
لڑائی کا آغاز ہوتا تھا ایسے — کوئی ملّا منبر پر کہتا ہو جیسے
تو کافر ہے دوزخ میں جائیگی بچو — انیتا بھی، بملا بھی اور رام رچو

اس مثنوی میں بچپن کی لڑائی کا تمام نقشہ کھینچا گیا ہے اور دلچسپ مُکالمے تحریر کیے گیے ہیں لیکن کم سِنی کے ان واقعات اور جھگڑوں کے بیان کے بعد اچانک گُریز اختیار کرتے ہوئے شاعر نہایت اہم مسئلے کی جانب اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے:

بتاؤ کہ پھر سے یہ تلوار کیوں ہے　　جناح اور گاندھی میں تکرار کیوں ہے

اس شعر میں اُس عہد کی سیاسی صورت حال کی تصویر بھی سما گئی ہے۔نظم ''جب اور اب''میں ناسٹلجیا کا احساس اُبھرتا ہے اور ماضی کی رُومانویت فکر و خیال پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔اس نظم میں دو مختلف زمانوں کا ذکر کر کے موازنے کی ایک صورت پیدا کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وقت جذبوں کو بھی تبدیل کر دیتا ہے۔اس کا بہاؤ ہر شے کو اپنے دھارے کے ساتھ ساتھ بہائے لیے جاتا ہے:

تم نے آج دروازہ جھٹ سے کیوں نہیں کھولا؟
چاند بجھنے لگتا ہے تارے ٹوٹ جاتے ہیں
آندھیاں سی اُٹھتی ہیں زلزے سے آتے ہیں۔

نظم ''منجمد بوسہ''میں بھی یاد کے نہاں خانوں سے اُبھرنے والے نقوش کو لفظوں کی مدد سے نمایاں کیا گیا ہے:

ٹھہرو مجھ کو بھی ترکیب بتا دو شہلا
کیا خبر کیسے لفافوں سے مجھے کام پڑے
کتنے بے کوندھ پٹ بھیڑنے ہوں گے مجھ کو(۱۰)
پھر لفافہ کھلا ، پھر ہونٹ پھرے
پھر ذرا پلکیں اُٹھیں، جھپکے مگر ہل نہ سکے
اور نگاہوں میں حیاؤں کے سمندر چھلکے
اب لفافہ جو ہوا بند تو پھر کھل نہ سکا

نظم ''ہر گل پہ نثار''میں اشفاق احمد نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ غمِ دہر، جذبہ عشق کو دھندلا دیتا ہے۔وقت کے بہاؤ میں جذبوں کی شدت باقی نہیں رہتی:

اب مرے سر میں وہ سودا نہیں وہ جوش نہیں
میں تری راہ سے گزروں بھی تو کیسے گزروں
پاؤں میں شرم و خجالت کی کڑی زنجیریں

موڑ پر ___ بیوفائی کی گرانڈیل فصیل
کاٹ سکتی بھی ہیں دیوار گرا سکتی بھی ہیں
تیز تقدیر کی سانوں پہ چڑھی شمشیریں
میری شہلا یہ دہر(۱۱) ہے تری آغوش نہیں!"

نظم "اوورکوٹ" میں افلاس کی پیدا کردہ بے بسی ومحرومی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

میں نے افلاس کے عفریت کے ہاتھوں بانو!
تم کو بھی بیچ دیا کوٹ کو بھی بیچ دیا

"اوورکوٹ" کے حوالے سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات معمولی اشیا سے پیدا ہونے والی وابستگیاں انھیں غیر معمولی اور بیش قیمت بنا دیتی ہیں۔ یہ نظم شاعر کی حساسیّت کی عکاسی کرتی ہے۔

اشفاق احمد نے اپنی حسّاس دلی کے باعث سماجی اور سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے گہرا اثر قبول کیا جس کا اظہار اُن کی نظموں میں بھی ہوا ہے۔ نظم "مروّت" میں اظہار افسوس ہے کہ معاشرہ اخلاقی اقدار سے بے بہرہ ہوتا جا رہا ہے:

ختم(۱۲) ہو گئی ہے مرّوت جہاں میں
تمھارا، ہمارا، ہمارا، تمھارا

اُن کی کئی ایک نظموں میں قحطِ بنگال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ نظمیں فکر و خیال کے اعتبار سے عمدہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ نوجوانی کی عمر میں ایسے موضوعات پر قلم اُٹھانا بلاشبہ اشفاق احمد کی پختہ فکری کی علامت ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی نظمیں "کوی، اب کی دیوالی، پیروانِ ہلاکو کی لاشیں اور پومپیائی" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نظم "کوی" میں قحطِ بنگال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اذیّت ناک صُورت حال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے: آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟

اُس نے دھرتی کے سینے پر خون کے دھارے دیکھے ہیں؟
ننگے روگی دیکھے ہیں کہ بھوک کے مارے دیکھے ہیں؟

یا گرتے بنگالی اک چاول پر سارے دیکھے ہیں؟
یامزدور کی آشاؤں پر چلتے آرے دیکھے ہیں؟
جلتا تو ہے اُس کی کٹیا میں دیپک، پر گھپ سا ہے
کیسی سوچ میں ہے آخر وہ آج بھلا کیوں چپ سا ہے؟
آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟

استفساریہ نشان شاعر کے ذہن میں جنم لینے والے اُس کرب ناک احساس کا ترجمان ہے کہ آخر انسانوں پر ایسا ظلم کیوں روا رکھا گیا ہے؟ دوسری جنگ عظیم نے بنگال میں جس قحط کو جنم دیا تھا اُس نے بلکتی ہوئی انسانیت کی ایسی ہول ناک تصاویر پیش کی تھیں جس نے فن کاروں کے ذہنوں میں ہزاروں سوالات کو جنم دیا تھا۔اشفاق احمد کی یہ نظم اسی فکر کی آئینہ دار ہے۔اسی سلسلے کی ایک اور مؤثر نظم ''پیروانِ ہلاکو کی لاشیں'' ہے اس نظم میں مکالمے کی صورت پیدا کی گئی ہے۔مچھر کے مکالمے سے نظم کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اس کا رُخ ایک بڑے مسئلے کی طرف مُڑ جاتا ہے کہ قحطِ بنگال کے نتیجے میں لوگوں کے بدن اس قدر بے جان ہو چکے ہیں کہ وہ اک بُوند خون سے کسی مچھر کی پیاس بھی نہیں بجھا سکتے۔

خوں کی اک بوند بھی بھوکے نہیں دے سکتے
ہائے اس ملک کی غیرت کہاں جا دبکی ہے
اب بھی بنگال کی لاشوں کو گلہ ہو گا کیا؟
اور تو اور یہ مچھر کو بھی دیتی ہیں جواب
ہائے اس ملک کی غیرت کہاں جادبکی ہے
اور اس ملک کا ہر پیر و جواں حرم ہے
'' میں نے اس جنگ میں دس پونڈ لہو بخش دیا
اب بھی آتی ہے مرے ہاتھ سے خوشبو دیکھو
میں گورنر سے ملا تھا تو ملایا تھا یہ ہاتھ''

یہاں معاشرے کی بے حسی پر بھی چوٹ کی گئی ہے کہ اس میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جوان

ناگفتہ بہ حالات وواقعات سے کوئی بھی اثر قبول کیے بغیر فرحاں وشاداں ہیں اور نہایت معمولی باتوں پر احساسِ تفاخر میں مبتلا ہیں۔اُن کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ بکھری ہوئی لاشوں کے انبار سے نظریں چُرا کر یوں گزر جاتے ہیں جیسے وہ اغیار کی لاشیں ہوں:

تو ہترے ملک کا ہر پیر و جواں
ناک کو ہاتھ کے حلقے میں چُھپا کر یوں گزر جاتا ہے
جیسے یہ لاشیں ہوں قزاقوں کی
جو ہلاکو کی قیادت میں یہاں آئے تھے

''ہلاکو''ظلم کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ ہم ''ہلاکو'' سے بھی بڑے ظالم ہیں کیوں کہ بے حسی حالات کی سختی کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔اشفاق احمد کی یہ نظم اپنے اندر آفاقیت کا جوہر لیے ہوئے ہے۔اس میں جس سفاکی اور بے حسی کی تصویر پیش کی گئی ہے اُس کا نظارہ عہدِ حاضر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

نظم ''اب کی دیوالی'' میں بھی بنگال کی صورت حال پر افسوس ناک تبصرہ کیا گیا ہے اور اُس کی تباہی کی داستان مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے:

نہ دیا چمکے کوئی نہ کوئی پروانہ ہے
نہ کوئی جھوم کے لہرائے نہ جھانجھر بولے
پر یہاں، گیت تو زنجیر ہی گاتی ہے صرف
جونہی بجھتا ہے تھرکتا ہوا آنسو کوئی
سسکیاں اُٹھتی ہیں، چھا جاتا ہے آہوں کا دھواں
اچھا تو
آؤ بنگال کی لاشوں کو اکٹھا کر لیں
ایک دو خون کی بُوندیں تو نکل آئیں گی

جگمگا اُٹھے گا دم بھر کو مرے گھر کا چراغ.....

سارے بنگال کا خون ____ ایک دیپک تو جلا دے گا ضرور

نظم ''پومپیائی'' میں بھی قحطِ بنگال کے پس منظر میں ارضی خداؤں کے رویّوں پر طنز ہے۔ بنگال جہاں ایک ایک دانے پر کتنی موتیں واقع ہو رہی ہیں اور زندہ انسان لاشوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ دھماکوں کے بغیر ہی یہاں تباہی کے گہرے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ شاعر پومپیائی کی لاشوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

پومپیائی کی زندہ لاشو آؤ
مردہ جاندار تم دکھلاؤں
بھات کے ایک ایک دانے کو
کتنے معصوم بلبلاتے ہیں
کتنا بے حس ہے کاتبِ تقدیر
کتنی موتیں ہیں ایک دانے پر
آؤ کھنڈرات سے نکل آؤ
پومپیائی کی زندہ لاشو، سنبھلو!
قہرِ ایزدی کا تم شکار ہوئیں
اور ان ارضی خداؤں نے دھماکوں کے بغیر
سارے بنگال کو شمشان بنا ڈالا ہے (۱۳)

نظم کے آخر میں ارضی خداؤں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کس قدر ارضی خداؤں کا کڑا حُکم ہے یہ
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

یہ نظمیں اشفاق احمد کے سیاسی و سماجی شعور کی غماز ہیں۔ نظم ''ایٹم بم'' میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر ہندوستان میں ایٹم بم بن جائے تو دوسری طاقتیں مرعوب ہو جائیں گی اور ایسا اقدام اس خطے

کی ترقی کا ضامن ثابت ہوگا:

ایک بھی کھل گئی گر کارگہِ ایٹم بم
کشورِ ہند کو امریکہ بھی سمجھا بہتر

نظم ''جمود''، ''دہریہ'' اور لاشعور'' میں شاعر زندگی کے اہم معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم ''جمود'' میں وہ زندگی کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے اس کی تجسیم کرتے ہیں:

زندگی
کوتاہ نظر، دول و فطرت، طوطا چشم (۱۴)
ہم ترا بارِ گراں سر پہ لیے پھرتے ہیں
تجھ پہ احسان تری قوم پہ احسان نہیں
تو مگر سر پہ چڑھی جاتی ہے
دھمکیاں سہہ کے مرے کان پکے جاتے ہیں
یہ صلہ تجھ سے محبت کا ملا ہے مجھ کو

اُنھوں نے نقطہء نظر پیش کیا ہے کہ آلام و مصائب زندگی کو طویل کر دیتے ہیں اور زندگی میں ایک جمود کا احساس بھر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں زندگی بارِ گراں محسوس ہونے لگتی ہے:

زندگی آنت ہوئی جاتی ہے شیطان کی آنت
روئی سے نکلے ہوئے دھاگے کی مانند دراز
زندگی
دوسرا نام ہے لمبائی کا
ایک بڑھتا ہوا ظلمات کا سیلاب تو ہے
رنج و غم فکر و پریشانی کا اک باب تو ہے
جس میں ہم بہتے ہیں اور بہنا ہی پڑتا ہے ہمیں
جس کو ہم سہتے ہیں اور سہنا ہی پڑتا ہے ہمیں

نظم ''دہریہ''میں ایک منکرِ خدا کے خیالات کا عکس پیش کیا گیا ہے لیکن نظم کے آخر میں عقلی دلائل دے کر خدا کے وجود کا اقرار و اعتراف کروایا گیا ہے:

منہ کے بل گر گیا الحاد کا مارا ہوا بے چارہ نحیف
ہاں خُدا ہیں، یہ خُدا ہیں ، یہ نظارے سارے
سُرمئی چوٹیاں تاروں پہ ہنسے جاتی ہیں
کون کہتا ہے خدا کوئی نہیں کچھ بھی نہیں
دہریہ اُونچے کہستانوں کے پاؤں سے چمٹ کر بولا
تالیاں بجنے لگیں اُونچے مناروں سے کوئی چلایا
کون کہتا ہے خدا کوئی نہیں کچھ بھی نہیں

نظم ''من چلے کا سودا''میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا کا ہر شخص خدا ہی کا متلاشی ہے اور اُسی کی کھوج میں مختلف راستے اپنائے ہوئے ہیں۔کوئی آسان اور کوئی دشوار گزار راستے پر چلتا ہے لیکن منزل سب کی ایک ہے اور مسلمان جو کئی فرقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں وہ سب اپنی اپنی عبادت گاہوں میں اُسی ایک خُدا ے وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ کو پکارتے ہیں:

ہم دونوں کا ہے ایک خُدا ہے ایک رسول اور قرآن ایک
اس واسطے ہم ، ہم رنگ ہیں سب ہم ساتھ چلیں گے قدم قدم
اور ورد کریں گے قدم قدم تم اپنی مسجد میں جانا
میں اپنی مسجد جاؤں گا(۱۵)

نظم ''لاشعور''میں اشفاق احمد نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آزادیِ نسواں کے نعروں اور ترانوں کے باوجود عورت کی فطرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی:

امن کا نام دیا میں نے جو مکتب کھولا
میں نے بنیادوں میں آزادی کی اینٹوں کو چنا

خود ترانے لکھے خود گانے مگر کچھ نہ ہوا
اک ذرا آرٹ سے پیدا ہوئی دلچسپی ضرور
میں نے جو کچھ بھی کیا ہند کی دختر کے لیے
اُس کی راحت کے لیے طالعِ اختر کے لیے
وہ مگر آپ کے کہنے کے بموجب شاید
بن سکی کچھ تو وہ فرہادوں کی شیریں ہی بنی

اشفاق احمد کی بعض نظمیں امیجری یا منظر نگاری کے حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہیں۔اس حوالے سے اُن کی نظمیں ''رخ کس نے یوں پھیرا ہے'' اور ''بلاعنوان'' قابلِ ذکر ہیں:

ستلج کے کنارے ہیں
نتھری سی فضائیں ہیں، کرنوں کے فوارے ہیں
وہ چاند پہ لپکا ہے
یہ شعلے پہ جھپٹتا ہے، جادو ہی تمھارے ہیں

نظم ''جب اور اب'' میں سمعی اور بصری متحرک تصاویر پیش کی گئی ہیں:

مرمریں گھروندے کے نقری دریچے سے
یہ صدائیں آتی تھیں
جاؤ ہم نہ کھولیں گے! جاؤ ہم نہ کھولیں گے
پائیلیں بج اُٹھتی تھیں، جھانجریں سی گاتی تھیں

اشفاق احمد نے اپنی نظموں میں کئی کرداروں سے متعارف کروایا ہے۔مثلاً زینو، شہلا، حمیدہ، کرشنا، زہرہ، ثریا اور بانو وغیرہ کے کرداروں سے یُوں مکالمہ کیا گیا ہے کہ اصلیت کا رنگ چمکنے لگتا ہے بل کہ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہ تمام کردار اشفاق احمد کی زندگی خصوصاً بچپن کے زندہ اور حقیقی کردار ہیں، جنھیں یادوں کے دریچوں سے جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''مکالمہ'' سے اشفاق احمد کو بے حد لگاؤ رہا ہے۔اسی سبب سے اُن کی نظموں میں انسانوں کے

مکالموں کے علاوہ مچھر اور سائیکل وغیرہ کے دل چسپ مکالمے بھی موجود ہیں۔نظم ''کرائے کی سائیکل'' میں سائیکل کا مکالمہ دل چسپی کا باعث بنتا ہے۔سائیکل اپنی حالتِ زار کا نقشہ خود بیان کر رہی ہے:

گھنٹی سے ہاتھ اُٹھا لو مری گدی کا خدا حافظ ہے
ایک ہی تو سہارا ہے مری رعنائی کا
توڑ ڈالو گے مرا پیچ خدارا چھوڑو
سارا شیرازہ بکھر جائے گا ہر جنس سے ٹکرائے گی جنس
میری خاطر نہ سہی اپنی تباہی سے بچو
اس مرے پیچ کے دم سے ہے یہ رونق ساری

اشفاق احمد بنیادی طور پر افسانے اور ڈرامے کے آدمی تھے۔اسی وجہ سے اُن کی نظموں میں بھی افسانویت اور ڈرامائیت کے عناصر رچے ہوئے تھے۔چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان، کرداروں اور مکالموں کی تخلیق اور شعور کی بہتی رو کا احساس، اُن کی نظموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اشفاق احمد کے کلام کا مطالعہ اُن کے ذہن کی زرخیزی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک تخلیق کار تھے، لہٰذا اُن کے سامنے اظہار کا جو بھی پیرایہ آ گیا انھوں نے اُسے بلا جھجک اختیار کر لیا کیوں کہ ادیب یا شاعر کسی ایک فارم یا ہیئت کا پابند نہیں ہوتا۔اُس کے ذہن میں جو بھی خیالات جنم لیں، انھیں کسی بھی فارم یا ہیئت میں ادا کر سکتا ہے۔اُن کی نظمیں اگرچہ ان کے فنکارانہ اظہار کی نمائندہ نہیں ہیں لیکن ان میں تخلیقیت بہر حال موجود ہے۔تمام نظمیں تاثرات کی پیش کش (Expression of thought) کی اچھی مثالیں محسوس ہوتی ہیں اور بیشتر نظمیں افکار و خیالات کے ایسے زوایے رکھتی ہیں جو سماجیات و سیاسیات کے کئی پہلو اُجاگر کرتی ہیں۔یہ نظمیں اشفاق احمد کو ایک بڑا شاعر تسلیم نہیں کرواتیں لیکن اُن کی تخلیقی شخصیت کے ایک نئے گوشے کو ضرور بے نقاب کرتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

(۱) مملوکہ لوک ورثہ اسلام آباد

(۲) ''مہ'' کی بجائے ''ماہ'' لکھنے سے شعر بے وزن ہوگیا ہے

(۳) ''نہ'' کا استعمال خلاف قاعدہ ہے۔

(۴) ''مہتاب'' کی بجائے ''ماہتاب'' لکھنے سے شعر بے وزن ہوگیا ہے۔

(۵) ''اثر'' کے لفظ کو غلط باندھا گیا ہے۔

(۶) ''لپکتا'' غلط باندھنے پر مصرع بے وزن ہے۔

(۷) ''اجل'' غلط باندھنے پر مصرع بے وزن ہے۔

(۸) ''کرم'' غلط باندھنے پر مصرع بے وزن ہے۔

(۹) ''تنِ تنہا'' کو غلط باندھنے پر مصرع بے وزن ہے۔

(۱۰) مصرع بے وزن ہے۔

(۱۱) ''دہر'' غلط باندھا گیا ہے۔

(۱۲) ''ختم'' غلط باندھا گیا ہے۔

(۱۳) متعدد مصرعے خام اور بے وزن ہیں۔

(۱۴) مصرع بے وزن ہے۔

(۱۵) نظم ''من چلے کا سودا'' مشمولہ ادبِ لطیف (ماہنامہ) لاہور۔مئی ۲۰۰۵ء (اشفاق نمبر) ص ۶۲۳
نظم ''من چلے کا سودا'' کے کچھ بند اشفاق احمد کے ٹیلی ڈرامے ''من چلے کا سودا'' (اشاعت: لاہور۔سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) میں بھی شامل ہوئے۔